۶۰ سال پہلے

علمی تحقیق، دعوت عام

علمی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ اب تک اس تحریک کا علمی کام تنہا میں ہی کرتا رہا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک اکیلا آدمی ایسی ایک ہمہ گیر و عالمگیر تحریک کے لیے علمی و فکری بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر یہ ہے کہ صرف اُردو زبان ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے، اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کر دے۔ نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی، اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سرِ نو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔

ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہو جائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح مذکورۂ بالا تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامتہ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانی ہوگی۔ کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہو سکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ وہ اُس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (''اشارات''، ابوالاعلیٰ مودودی، ماہنامہ ترجمان القرآن، جلد ۲۰، عدد ۴، ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ، جون ۱۹۴۲ء، ص ۲۱۳-۲۱۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ریفرنڈم کے بعد——

”اصلاحات“ کا تسلسل یا اصلاح احوال

پروفیسر خورشید احمد

انسان اپنے منصوبے بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو اصل حاکم اور کارفرما ہے اپنی تدبیر کرتا ہے اور بالآخر ہوتا وہی ہے جو مشیت الٰہی کا تقاضا اور رضاے الٰہی کا مطلوب ہوتا ہے (وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ، وہ اپنی تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے اپنی تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اٰل عمرٰن ۳:۵۴)۔ اور یہی وجہ ہے کہ بارہا انسان کو ایک چیز بری لگتی ہے لیکن بالآخر اس کے نتائج اور ثمرات کچھ دوسرے ہی نکلتے ہیں۔ ایک چیز کو وہ بہت شوق اور اہتمام سے کرتا ہے مگر اس کے نتیجے میں نقصان اور ہزیمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بری ہو--- اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ البقرہ ۲:۲۱۶)

بصیرت کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیہ ریفرنڈم میں بھی قضا و قدر کے ایک ایسے ہی قاعدے کی کارفرمائی تھی۔ جنرل پرویز مشرف جن کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تقریباً پوری قوم کی تائید حاصل تھی اور ایک ناگوار عمل (فوجی مداخلت) کو اصلاحِ احوال کی ایک اُمید کی بنیاد پر تمام دینی اور سیاسی قوتوں نے، باستثناے چند، اس لیے قبول کیا تھا کہ غیر جانب دار احتساب کے ذریعے ملک کو لوٹنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے گا اور جلد از جلد ملک میں آزاد انتخابات کے ذریعے ایک نئی اور امانت دار قیادت اُبھر سکے گی، لیکن اس قومی ایجنڈے پر

عمل کرنے کے بجائے انھوں نے اپنا ہی ایک ایجنڈا تصنیف فرما ڈالا۔ احتساب کو ایک مذاق اور التفات و انتقام کا آلہ بنا ڈالا۔ ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور اور مجروح کرنے والی سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ فوج میں اکھاڑ پچھاڑ اور سیاست میں ''ہم خیالوں'' اور ''شاہ پرستوں'' کا کھیل شروع کر دیا۔ بھارت سے پینگیں بڑھانے اور امریکہ کے عالمی کھیل میں ایک بے جان مہرہ بن جانے تک پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر امریکہ کو کندھا دے کر افغانستان کے معصوم انسانوں کے خون ناحق کی ذمہ داری بھی اپنے شانوں پر لے لی۔

ریفرنڈم سے جنرل پرویز مشرف کے دو مقاصد تھے، ایک وہ سند جواز (legitimacy) حاصل کرنا جو اقتدار پر قابض ہونے کے باوجود ان کو حاصل نہیں اور دوسرے اپنے اقتدار کی مدت کو طول دینا کہ سپریم کورٹ کی عطا کردہ تین سال کی مہلت اب ختم ہو رہی ہے اور ان کو ملک کے نظام کی تشکیل نو اور اپنی ''اصلاحات'' کے تسلسل اور تکمیل کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ لیکن ریفرنڈم جس طرح منعقد کیا گیا، اس سے ان کی سند جواز مزید مشتبہ ہو گئی اور انھیں اپنی پالیسیوں کے تسلسل کے لیے کوئی مینڈیٹ حاصل نہ ہوا۔ پاکستانی عوام نے بچشم سر دیکھا اور ساری دنیا کو ملکی اور عالمی میڈیا نے بتایا کہ بوگس ریفرنڈم ایک تاریخی دھاندلی تھا، محض ایک ڈھونگ جس نے صدر مشرف کو درحقیقت کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔

تاریخ اور سپریم کورٹ نے جو موقع موجودہ قیادت کو دیا تھا اس نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی ۳۰ ماہ کی کارکردگی بحیثیت مجموعی بے حد مایوس کن ہے۔ اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے ''اصلاحات کے تسلسل'' کا افسانہ تراشا اور ریفرنڈم کو اس کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ریفرنڈم میں تو وہ ناکام رہی لیکن اصلاحات اور ان کے تسلسل کی باتیں ابھی ہو رہی ہیں اور اس کے لیے سیاسی جوڑ توڑ اور صف بندی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ''اصلاحات'' اور ان کے ''تسلسل'' کے وعدوں کا بھی بے لاگ جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم نے ملک کو کیا دیا ہے اور کس چیز سے محروم کیا ہے۔

پالیسیوں میں تسلسل کے نام پر جس طرح ایک شخص کو محور بنایا جا رہا ہے اور اس کی مدت اقتدار کو ان کے مدار مہام کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، یہ بات ہی سرے سے غلط ہے۔ ہر انسان فانی ہے اور فانی انسانوں پر کسی تسلسل کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ بودا سہارا ہے۔

اگر پالیسیوں کے تسلسل کے لیے کسی خاص فرد پر انحصار ضروری ہوتا تو پھر نظام حکومت میں وقت کے تعین سے عہدوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر پارلیمنٹ چند سال کے لیے کیوں ہو؟ پھر صدر مملکت کے

لیے ایک یا دو مدت کی حد کیوں رکھی جائے؟ پھر فوج کے سربراہ کے لیے تین سال کی مدت کیوں رکھی جائے؟ پھر ایک خاص مدت کے بعد اہم عہدوں پر فائز افراد کا تبادلہ کیوں ہو؟ تسلسل کا جو تصور آج پیش کیا جا رہا ہے' یہ آمریت کی راہ ہموار کرنے والا ہے۔ اسے اسلام یا جمہوریت کے معروف اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ یہ عقل اور تجربے سے مطابقت رکھتا ہے۔

جنرل صاحب نے ریفرنڈم کی مہم میں اپنے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے سات نکاتی ایجنڈے کو مرکزی اہمیت دی ہے اور اپنی اصلاحات اور کارناموں کا ذکر بڑے دعوے کے ساتھ کیا ہے۔ ہم صرف ان کے مرکزی نوعیت کے وعدوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کو جاری رکھنے کے لیے وہ حاصل شدہ تین سالوں پر فی الحال مزید پانچ سال کا اضافہ چاہتے ہیں۔

امن و امان کی مخدوش صورت حال

سب سے پہلی چیز امن و امان اور جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ یہ ہر حکومت کا اولیں فرض ہے لیکن فوجی حکومت کا تو سب سے مضبوط یا سب سے کمزور پہلو امن و امان کے باب میں اس کا ریکارڈ ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ایک عام پاکستانی اور پاکستان میں آنے والا ہر غیرملکی اپنے کو جتنا غیر محفوظ پاتا ہے' پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ لا اینڈ آرڈر کی حالت ماقبل کے ادوار میں بھی مخدوش رہی لیکن فوجی حکومت نہ صرف حالات کو بہتر نہیں کر سکی بلکہ اس کے دور میں لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

صرف چند حقائق صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے قابل غور ہیں۔

کراچی میں لاقانونیت کس انتہا کو پہنچ چکی ہے' ۸ مئی ۲۰۰۲ء کا واقعہ جس میں ۱۴ افراد ہلاک ہوئے اور جس کے نتیجے میں پاکستان نیوی کا ایک اہم دفاعی منصوبہ التوا کا شکار ہو گیا ہے' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈینیل پرل کا واقعہ کراچی میں اور اسلام آباد میں سفارتی علاقے میں چرچ پر حملہ ساری دنیا میں پاکستان کا منہ کالا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ کراچی میں پچھلے چند سال میں ۱۸۲ افراد کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر قتل کیا گیا ہے اور جن ۲۹۸ افراد کو شبہے میں گرفتار کیا گیا ان میں سے صرف دو کو سزا ہوئی ہے' باقی سارے کیس معما بنے ہوئے ہیں۔ ۹۰ ڈاکٹروں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر احتجاج میں ہڑتال کر رہے ہیں اور امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹر تفتیش کے سارے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں مگر نہ کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے اور نہ یہ سلسلہ بند ہوتا ہے۔ سندھ میں سالانہ ۱۰۰ افراد اغوا کیے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے زمین دار اس کی پشت پر ہیں لیکن قانون کا ہاتھ کسی کو گرفت میں نہیں لے پاتا۔

ایک جائزے کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۹ء سے وسط ۲۰۰۱ء تک ملک میں ۱۲۷ دہشت گردی کے واقعات

ہوئے ہیں جن میں ۴۵۷ افراد جاں بحق ہوئے مگر نام نہاد مقابلے میں چند افراد کے مارے جانے کے سوا کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا۔ پنجاب میں ایک مطالعے کے مطابق ہر ڈیڑھ منٹ میں اوسطاً ایک جرم واقع ہو رہا ہے۔ ہر ایک گھنٹے اور ۴۳ منٹ کے بعد ایک قتل کا واقعہ رونما ہو رہا ہے اور ۲۰۰۰ء میں ۴ ہزار ۳ سو ۲۹ کے مقابلے میں ۲۰۰۱ء میں ۴ ہزار ۶ سو ۱۳ جرائم وقوع پذیر ہوئے۔ اقدامات قتل بھی ۵ ہزار ۶ سو ۳۳ کے مقابلے میں ۵ ہزار ۶ سو ۴۹ ہوئے ہیں۔ ہر ۲۶ منٹ میں ایک شخص پر حملہ ہوا ہے جس میں وہ مجروح ہوا ہے۔ ہر آٹھ گھنٹے میں ایک سرکاری ملازم پر حملہ ہوا ہے اور ہر چار گھنٹے میں ایک خاتون کی عصمت لوٹی گئی ہے۔ اغوا کی واردات ہر ۴۵ منٹ پر واقع ہوئی اور ہر گھنٹے بعد ایک ڈاکا پڑا ہے۔ (ہفت روزہ انڈی پنڈنٹ، ۲۶ دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۳)

یہ ہے ملک کے سب سے بڑے صوبے کی صورت حال۔ لاہور میں روزانہ سات اور کراچی میں ۲۴ گاڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ کراچی میں صرف ایک سال میں ایک ہزار گاڑیاں اٹھائی گئیں۔ پولیس جو قانون کو نافذ کرنے والی اور عوام کی محافظ ہے جرائم کی سرپرست ہی نہیں خود ان کا ارتکاب کرنے میں مصروف ہے۔ سرکاری اعداد و شمار ایک ہوش ربا صورت حال کا پتا دیتے ہیں اور حکمران ہیں کہ لا اینڈ آرڈر پر قابو پالینے کے دعوے کر رہے ہیں۔ (انڈی پنڈنٹ، ۵ دسمبر ۲۰۰۱، ص ۱۰)

پنجاب پولیس کی کارکردگی کی جو رپورٹ انڈی پنڈنٹ میں شائع ہوئی ہے اس کی رو سے پنجاب پولیس کے کل عملے کا ۳۵ فی صد اور لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کا ۴۱ فی صد بدعنوانی اور جرائم کا مرتکب ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے نو مہینے میں پنجاب پولیس کی ۹۸ ہزار نفری میں سے ۳۴ ہزار ۵ سو ایک کسی نہ کسی جرم یا بدعنوانی کے مرتکب رہے ہیں اور لاہور پولیس کی ۱۶ ہزار نفری میں سے ۶ ہزار ۵ سو ۱۴ کو کسی نہ کسی جرم میں سزا دی گئی ہے۔ معاملہ محض نیچے کے عملے کا نہیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والوں مین چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، ۸۲۸ انسپکٹر، ۲ ہزار ۷ سو ۲۳ سب انسپکٹر، ۳ ہزار ۸ سو ۳۷ اسسٹنٹ سب انسپکٹر، ایک ہزار ۷ سو ۵۰ ہیڈ کانسٹیبل اور ۲۵ ہزار ۳ سو ۲۳ کانسٹیبل شامل تھے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی گرفت ہو سکی --- قیاس کن ز گلستان من بہار مرا!

پھر اگر امن و امان کا وہ حال نہ ہو جو ہے تو کیا ہو۔ پولیس اصلاحات کی بڑی باتیں ہو رہی ہیں لیکن جو کچھ سامنے آ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظالم اور کرپٹ پولیس کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا ہے اور توازن کا جو نظام بصورت پبلک سیفٹی کمیشن تجویز کیا جا رہا ہے وہ اول تو وجود میں نہیں آ رہا، اس کے اختیارات محدود ہیں اور پھر اطلاعات ہیں کہ جہاں کہیں وہ بنائے جا رہے ہیں ان کے لیے جو نام آ رہے ہیں ان میں بڑی تعداد خود مجرموں کی ہے (دی نیوز، ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء)

جیلوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد جس طرح جرم کی طرف جا رہی ہے اور بحیثیت

مجموعی ملک میں قانون کا احترام جس طرح ختم ہو رہا ہے وہ ہولناک ہے۔ جب دستور اور قانون کا حلف اٹھانے والے اور ان کے نفاذ کے ذمہ داران ہی ان کا احترام نہیں کرتے تو معاشرہ تباہ حال نہ ہو تو کیا ہو۔

کراچی میں فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی تفصیل نیوز لائن (مئی ۲۰۰۲ء) نے دی ہے جس سے گزشتہ پانچ سال، خصوصیت سے پچھلے تین سال میں قانون کی گرفت کے ڈھیلے ہونے اور خون مسلم کی ارزانی میں اضافے کی تصویر سامنے آتی ہے: ۱۹۹۸ء میں ۵، ۱۹۹۹ء میں ۱۲، ۲۰۰۰ء میں ۱۸، ۲۰۰۱ء میں ۵۸، ۲۰۰۲ء (جنوری/اپریل) میں ۲۲۔

لاہور جیسے شہر میں خود فوج کے زیر ملازمت اور ریٹائرڈ ارکان پر حملوں کی رپورٹ امن وامان کی مخدوش صورت حال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے ۱۰ مہینوں میں صرف لاہور میں ۳۰ فوجی نشانہ بنے جن میں جنرل، بریگیڈیئر، کرنل اور میجر کے درجے کے افسران شامل ہیں۔ (انڈی پنڈنٹ ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء، ص ۴)

لیکن اس سلسلے کی سب سے ہولناک اور ہوش ربا صورت حال، حال ہی میں شائع ہونے والی ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ انٹرنیشنل (SAPI) کی رپورٹ ہے جس میں پاکستان سمیت کئی ممالک میں بچوں سے زیادتی کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور اس کی رو سے ۲۰۰۰ء میں ۱۹۹۹ء کے مقابلے میں پاکستان میں بچوں سے جنسی زیادتی کے واقعات میں ۳۹ فی صد کا اضافہ ہوا ہے، یعنی ۹۴۵ کے مقابلے میں ایک ہزار ۳ سو ۱۷۔ ان ظلم کا نشانہ بننے والوں میں سے ۶۰ فی صد لڑکیاں ہیں۔ رپورٹ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ رپورٹ کیے جانے والے واقعات اصل واقعات کا صرف ۱۰ فی صد ہیں۔

اگر فوجی حکومت کے دور میں امن وامان اور جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا یہ حال ہے تو اس پر جنرل پرویز مشرف اور جنرل معین حیدر کو شرمسار ہونا چاہیے نہ کہ اسے کارکردگی اور کارنامے کی فہرست میں کوئی جگہ دی جائے۔

نیب کی کارگزاری

اس حکومت کا دوسرا ''کارنامہ'' احتساب کا نظام ہے۔ آیئے اس کی کارکردگی کا بھی مختصر جائزہ لیں۔

نیشنل اکاونٹیبلٹی بیورو، نیب (National Accountability Bureau) کو گزشتہ ۳۰ ماہ میں تین سربراہان کی قیادت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہاں تسلسل کے اصول کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ پالیسی کے اصولوں کی۔ پہلے دعویٰ تھا کہ احتساب بلاتخصیص ہوگا۔ پھر جرنیلوں اور ججوں کو دائرے سے باہر رکھنے کا اعلان ہوا مگر جب اس پر ہر طرف سے واویلا مچا تو اشک شوئی کے لیے ان کو بھی دائرے میں رکھ

لیا گیا۔

بیورو کی جو رپورٹ خود اس نے شائع کی ہے اس کی رو سے ادارے نے ایک ہزار ۴۳ کیس تحقیق کے لیے وصول کیے۔ ان ۳۰ ماہ میں صرف ۲۸۷ معاملات کی تفتیش مکمل ہو سکی ہے۔ گویا صرف ۲۷.۵ فی صد باقی ۶۶ فی صد ابھی زیرِ تفتیش ہیں۔ سیاست دانوں میں دو سابق وزراے اعظم، ۱۳ وزراے اعلیٰ، ۶۲ ارکان قومی اسمبلی اور ۱۰ اسینیٹ کے ارکان ہیں اور ۱۰۸ کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے ہے۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد تقریباً دو تہائی اور ایک تہائی ہے۔

جن مقدمات کی تفتیش کی گئی ہے ان میں سے ۸۷ سے سودے بازی کے بعد مک مکا ہو چکا ہے اور روایت یہ ہے کہ اس حربے کو سیاست دانوں کو "ہم خیال" بنانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو، جب بھی یہ احتساب کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا معما یہ ہے کہ خود میاں نواز شریف صاحب پر سارے دعووں اور مواد کی موجودگی کے باوجود مالی بدعنوانی اور قوم کو لوٹنے کے الزام پر مقدمہ نہیں چلایا گیا، بلکہ جہاز ہائی جیک کرنے اور ہیلی کاپٹر کے معاملات پر مقدمہ چلا اور پھر اس قدر سنگین بدعنوانیوں اور الزامات کے باوجود ان سے معاملات طے کر کے باہر بھیج دیا گیا۔ دونوں سابق وزراے اعظم اور ان کے اہل خاندان کے علاوہ یہی کچھ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور سیاسی تجزیہ نگار صاف کہہ رہے ہیں کہ:

> نیب کے سیاست زدہ ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکمران نیب کو اپنے سیاسی مخالفین سے سمجھوتہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جس طرح کچھ بہت ہی بدنام کرپٹ سیاست دانوں کو احتساب سے باہر رکھا گیا ہے، اس سے نیب کی انصاف پسندی پر شبہات وارد ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک معما ہے کہ گو نیب کا دعویٰ ہے کہ اس نے اب تک ۷۵.۵۹۶ ارب روپے کی بازیافت (recovery) کی ہے۔ لیکن سرکاری خزانے کو جو رقم عملاً منتقل کی گئی ہے وہ صرف ۱۱.۲ ارب روپے ہے، یعنی اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان نے صرف یہ رقم وصول کی ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

نیب کی کارکردگی اور غیر جانب داری پر ایک بڑا دھبا وہ خط ہے جو اس کے سابق چیئرمین جنرل خالد مقبول نے اپنے نیب سے رخصت ہونے سے پہلے تین سروس چیفس کو لکھا تھا اور ایرفورس کے دو سابق

سربراہوں اور فوج کے ایک سابق سربراہ کے دور میں ہونے والی سنگین بدعنوانیوں کی تحقیق کی اجازت چاہی تھی لیکن یہ اجازت نہ جنرل خالد مقبول کو ملی اور نہ ان کے جانشین کو (انڈی پنڈنٹ، ۹ اگست ۲۰۰۱ء، ص ۱)

جنرل پرویز مشرف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اوپر کی سطح سے کرپشن ختم کر دی ہے۔ بظاہر ان کے وزرا کے بارے میں اس قسم کی چہ میگوئیاں نہیں ہو رہیں جو ماضی کی حکومتوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک تو کرپشن صرف مالی سودوں اور کک بیکس کا نام نہیں، وسائل کا غلط استعمال جس شکل میں بھی ہو وہ کرپشن کے زمرے میں آتا ہے اور جو کچھ ریفرنڈم میں ہوا اسے کسی اور نام سے پکارا جانا ممکن نہیں۔ پھر بین الاقوامی سطح پر کرپشن کے ادراک کا جو نظام بھی ہے اس میں پاکستان کے مقام اور حیثیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی بہتری نہیں آئی ہے بلکہ تازہ ترین رپورٹ جو ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے شائع کی ہے اس میں کرپشن کے اشاریے میں اضافہ آیا ہے۔ ۱۹۹۸ء کے اشاریے کی رو سے نیچے سے ہمارا نمبر ۱۱ تھا اور ۱۰ کے اسکیل میں ہمارا اسکور ۲.۷ تھا لیکن ۲۰۰۱ء کی رپورٹ میں نیچے سے اب ہمارا شمار صرف سات پر ہے اور اسکور بھی اور نیچے آ گیا ہے، یعنی ۲.۳۔

انفرادی واقعات کے بیان سے ہم نے ہمیشہ گریز کیا ہے لیکن صرف تذکیر اور انتباہ کے لیے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اخبارات میں ۲۸ ججوں کی فہرست آئی ہے جن کا تعلق سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ سے ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حلف نامہ دے کر انھوں نے ایک یا ایک سے زیادہ پلاٹ بلا استحقاق حاصل کیے ہیں (انڈی پنڈنٹ، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۲۴)۔ لیکن احتساب کے نظام کو کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

دی ہیرالڈ اور دوسرے رسائل نے موجودہ حکومت کے دور میں ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ کے ادارے میں ۱.۴ ارب روپے کے خرد برد کی رپورٹیں شائع کی ہیں جو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی ۳۱ جنوری ۲۰۰۲ء کی میٹنگ میں سامنے آئی ہیں۔ قومی تعمیر نو بیورو کے چیئرمین اس نظام کا دماغ کہے جاتے ہیں، ان کے ایک کزن کموڈور سید طیب نقوی (چیئرمین کراچی فشریز ہاربر اتھارٹی کے) بارے میں لاکھوں کروڑوں کی کرپشن کی شکایات حکومت سندھ کو دی گئی ہیں۔ اطلاع ہے کہ ان کے ہٹائے جانے کے احکام خود چیف ایگزیکٹو کی طرف سے جاری ہوئے مگر ان پر عمل روک دیا گیا (انڈی پنڈنٹ، ۳۰ اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۴)۔ اور حال ہی میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں نارکوٹکس بورڈ کے سربراہان کے جو وزرائے داخلہ ہوتے ہیں، وہاں کی گاڑیوں کے ناجائز استعمال کی رپورٹیں آئی ہیں اور اس میں سابقہ وزرائے داخلہ کے ساتھ موجودہ وزیر داخلہ کا نام بھی آتا ہے (دی نیشن، ۶ مئی ۲۰۰۲ء)۔

محکمہ خوراک میں کرپشن کے جو واقعات ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء کے مالی سال کے بارے میں سامنے آ رہے

ہیں وہ ۳ ارب ۲ کروڑ روپے سے متجاوز ہیں۔ وزارت سیاحت میں ۹ کروڑ کے حسابات غائب ہیں (نوائے وقت ' ۱۳ مئی ۲۰۰۲ء)۔ ادویات کی خرید میں ۹۱ کروڑ کی گڑبڑ کی بات بھی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے آئی ہے (دی نیشن ' ۸ مئی ۲۰۰۲ء)۔

تقرریوں میں بھی من مانی کا اسی طرح رواج ہے حتیٰ کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے سابق ارکان کو جو قانوناً اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت میں کوئی تنخواہ والا کام نہیں کر سکتے' دھڑا دھڑ نوازا جا رہا ہے (دی نیوز ' ۷ مئی ۲۰۰۲ء)۔ اس سال کی ورلڈ بنک کی کمیٹی نے جو رپورٹ مئی ۲۰۰۲ء میں دی ہے اور جسے بی بی سی نے سیربین کے پروگرام میں ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء کو نشر کیا ہے اس کے مطابق پاکستان میں تین سرکاری ادارے کرپشن کا گڑھ ہیں' یعنی سی بی آر' واپڈا اور کے ای ایس سی۔ اس سے پہلے خود وزارتِ خزانہ کی ٹیکس نظام میں اصلاحات کی ٹاسک فورس نے (ورلڈ بنک کے سابق نائب صدر شاہد حسین صاحب کی سربراہی میں) اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سی بی آر' پولیس' ماتحت عدالتیں اور واپڈا کرپشن میں سب سے پیش پیش ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ کرپشن کا خاتمہ ہو گیا ہے تو "ناطقہ سربگریباں ہے' اسے کیا کہیے"۔

وفاقیت کا اصول

جنرل صاحب نے وفاقی نظام کے استحکام اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کی بات بھی کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت اور وفاقیت کا اصول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فوجی حکومت کے معنی ہی وحدت اختیار (unity of command) ہے۔ صوبے اپنی تمام خودمختاری سے محروم ہو جاتے ہیں اور صرف ایک شخص کی پالیسی ہر جگہ نافذ ہوتی ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کے اصول کو جتنا نقصان فوجی ادوار میں پہنچا ہے اس کا شمار بھی مشکل ہے۔ فوجی اقتدار کے ۲۶ سال وفاق کے لیے سب سے تاریک سال رہے ہیں۔ لیپاپوتی اپنی جگہ لیکن آج بھی حقیقت ہے کہ مسئلہ پانی کی تقسیم کا ہو یا مالی وسائل میں شرکت کا' قرضوں کی بات ہو یا ان پر وصول کیے جانے والے سود کی' زمین کی تقسیم کی بات ہو یا ترقیاتی پروگراموں اور غربت مٹانے کے منصوبوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی' چھوٹے صوبوں کی شکایات اس مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سرکاری اتھارٹی سے جو صدیوں سے سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے چھوٹے صوبوں کے نمایندوں نے واک آؤٹ کیا اور صدر کو مداخلت کرنا پڑی۔ تھل نہر کا مسئلہ بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ صوبوں کے درمیان متعدد امور پر شدید کشیدگی ہے۔ بلوچستان میں بار بار ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ قوم پرست عناصر کی بن آئی ہے اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور یو این او کی مداخلت کی باتیں کر رہے ہیں۔ صوبوں کے درمیان کش مکش ہی نہیں اب تو صوبے کی سول انتظامیہ اور کور کمانڈروں کے اختلافات بھی سامنے آ رہے ہیں اور صرف چھوٹے صوبوں میں

ہی نہیں‘ خود پنجاب کے گورنر اور لاہور کے کور کمانڈر کے اختلافات اور اس کی بنیاد پر بیوروکریسی میں صف بندی سے سب واقف ہیں اور شفاف حکمرانی کی خیر منا رہے ہیں۔

اگر ان تمام امور سے صرف نظر کرلیا جائے اور ”سب اچھا ہے“ کی رٹ لگائی جاتی رہے تو اس سے زمینی حقائق تو تبدیل نہیں ہو جاتے۔ اختلافات کو افہام و تفہیم سے دُور کرنے کے لیے نمایندہ حکومت اور جمہوری عمل سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں۔

معاشی ترقی کا سراب

جنرل مشرف نے اپنی معاشی اصلاحات اور کارکردگی کو ریفرنڈم کی مہم میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کے ہم نوا اور ہم خیال بھی مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافے اور بیرونی قرضوں اور امداد کے حصول کو بڑے فخر سے پیش کر رہے ہیں۔ ایک ”مذہبی بزرگ“ نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ معیشت کی کارکردگی کو جانچنے کے جتنے بھی اشارے (indicators) ہیں وہ سب مثبت اور روشن ہیں۔ ہم پورے ادب سے عرض کریں گے کہ حالات کی یہ تصویرکشی بڑی جزوی‘ اپنی پسند کی اور بڑی حد تک جانب داری پر مبنی ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ماضی کی سیاسی حکومتوں کی معاشی کارکردگی ہرگز قابل فخر نہ تھی اور وہ ملک کو مسلسل قرضوں کے شکنجوں میں کس رہی تھیں اور نفع عاجلہ کی خاطر حقیقی معاشی اصلاحات سے غافل تھیں لیکن ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ موجودہ حکومت کی معاشی ٹیم نے بھی کسی بنیادی اصلاح کی فکر نہیں کی ہے۔ اس ٹیم پر بنک کاروں کا غلبہ ہے اور ہمیں احساس ہے کہ وہ اچھے بنک کار ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ملک کی معیشت صرف ایک بنک کی مانند نہیں۔ جب تک اصل معاشی مسائل کا حل تلاش نہ کیا جائے‘ معاملات سطحی رہیں گے اور مسائل و مشکلات گرفت میں نہیں آئیں گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہوشیار بنک کاری اور قرض دینے والے آقاؤں کی نظر التفات کے باعث‘ مبادلہ خارجہ کی صورت حال میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ ۱۹۹۹ء میں یہ ذخائر خطرناک حد تک کم ہوگئے تھے اور خصوصیت سے ۱۹۹۸ء کے بیرونی حسابات کو منجمد کرنے کے تباہ کن اقدام نے تو ساری دنیا میں ہماری ساکھ کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس میدان میں آج ہماری پوزیشن بہت بہتر ہے اور مئی ۲۰۰۲ء میں مبادلہ خارجہ کے ذخائر ۵.۳ ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس ایک اشارے سے جو نتائج نکالے جارہے ہیں اور جس طرح اس کا کریڈٹ لیا جا رہا ہے وہ حدِ انصاف سے متجاوز ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ توازنِ ادائیگی (balance of payments) گذشتہ ۲۰‘ ۲۵ سال میں پہلی مرتبہ ایک خاص حساب کے مطابق مثبت ہوا ہے‘ یعنی اگر حکومت کو ملنے والی رقوم (official transactions) کو شامل کرلیا جائے جو بیرونی ممالک سے عطیہ یا قرض ہیں

تو توازن ادایگی ۳۳۱ ملین کے نفع (surplus) میں آجاتا ہے‘ اور اگر سرکاری ترسیل کو شامل نہ کیا جائے اور صرف تجارت اور دوسرے مالی transactions تک توازن ادایگی کو محدود رکھا جائے تو خسارہ ۵۰۸ ملین ڈالر ہوتا ہے جو ماضی کے اوسطاً ۳ ارب ڈالر کے خسارے سے کہیں کم ہے۔ اس کا کریڈٹ صرف ایک حد تک حکومت کو جاتا ہے کیوں کہ اس کی اصل وجہ تجارت کے خسارے میں کمی ہے جو درآمدات میں کمی کی وجہ سے رونما ہوا ہے‘ برآمدات کے اضافے کی وجہ سے نہیں۔ نیز بیرون ملک پاکستانیوں کی ترسیلات میں دوگنا اضافہ بین الاقوامی حالات‘ امریکہ میں پاکستانیوں کے سرمایے کے غیر محفوظ ہوجانے اور عرب امارات میں غیر سرکاری ترسیلات پر پابندی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس ظاہری نفع کے پیچھے بڑے تلخ حقائق ہیں جن میں سب سے اہم چیز برآمدات کا جمود ہے۔ ۱۹۹۸ء سے قبل ملک کی برآمدات ۱۰ ارب ڈالر تک پہنچ رہی تھیں اور اس سال کے لیے بھی یہی ہدف تھا مگر عملاً پہلے ۱۰ مہینے میں ۷.۳۲۳ ارب ڈالر کی برآمدات ہوئی ہیں اور بہت زور لگایا تو توقع ہے ۸.۵ ارب اور ۹ ارب کے درمیان ہوسکیں گی‘ یعنی ہدف سے ۱۰ سے ۱۵ فی صد کم! چونکہ درآمدات میں کمی برآمدات میں کمی سے زیادہ ہوئی ہے‘ یعنی ۱.۷ فی صد کے مقابلے میں ۶.۹۳ فی صد‘ اسی لیے توازنِ تجارت کے خسارے میں کمی آگئی ہے۔ اس کمی سے توازنِ ادایگی اور مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں تو بہتری آئی ہے لیکن اسے معیشت کے لیے صحت مند قرار دینا معاشی اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہوگا۔

برآمدات میں کمی دراصل معیشت میں جمود اور پیداواری عمل میں سستی کا نتیجہ ہے۔ قومی پیداواری شرح ترقی جو چھٹے منصوبے کے دوران (۱۹۸۳-۸۸ء)‘ ۶.۳ فی صد سالانہ تھی‘ ساتویں منصوبے (۱۹۸۸-۹۳ء) کے دوران ۴.۸ فی صد رہی اور آٹھویں منصوبے (۱۹۹۳-۹۸ء) کے دوران ۴.۲ فی صد ہوگئی‘ ۱۹۹۹-۲۰۰۱ء میں گھٹ کر ۳.۶ فی صد رہی اور اس سال ۲۰۰۱-۲۰۰۲ء کے بارے میں اندازہ ہے ۳ فی صد یا اس سے کچھ کم ہوگی۔ اسی طرح درآمدات میں کمی کا اثر بالآخر ملک کی پیداوار پر پڑے گا اور اس طرح خسارے میں یہ کمی کوئی نفع کا سودا نہیں۔ پھر اسٹیٹ بنک نے کھلی منڈی سے ڈالر خرید کر مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے مبادلہ خارجہ کو سہارا ضرور میسر آیا ہے اور ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت میں بھی استحکام آیا لیکن اس طرح جو ذخائر حاصل ہوئے ہیں وہ کسی پیدا آوری عمل کا نتیجہ نہیں‘ بلکہ ان کے حصول کے لیے جو ۲۰۰ ارب روپیا استعمال میں آیا ہے وہ ایک غیر پیدا آوری عمل کی نذر ہوگیا۔ اگر اسے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا‘ تو یہ روزگار کی فراہمی‘ غربت کے خاتمے اور پیداوار کے اضافے میں مددگار ہوسکتا تھا۔

کسی ملک کی معیشت کو جانچنے کا صحیح معیار ملکی پیداوار میں اضافہ' برآمدات میں اضافہ' تقسیم دولت میں انصاف' روزگار کی فراہمی' فی کس آمدنی میں اضافہ' سرمایہ کاری میں اضافہ اور معیشت کے پھیلاؤ کے ساتھ ٹیکس کی آمدنی میں اضافہ ہے لیکن ان میں سے جو بھی اشارہ آپ لیں معیشت کی صورت حال اچھی نظر نہیں آئے گی۔ ملک میں سرمایہ کاری میں کمی آرہی ہے اور یہ شرح پچھلے چند سالوں میں قومی پیداوار کے ۱۷ اور ۱۸ فی صد سے کم ہو کر ۱۳ فی صد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کی بڑی توقعات تھیں لیکن وہ بھی پوری نہیں ہوئیں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں سالانہ بیرونی سرمایہ کاری ۱.۵ ارب ڈالر سے متجاوز ہو گئی تھی جو ۱۹۹۹ء میں ۶۰۰ ارب ڈالر پر آگئی تھی۔ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں یہ گر کر ۱۸۰ ملین ڈالر ہو گئی۔ سال رواں میں ۲۸۷ ملین ڈالر ہوئی ہے جو ۵۰۰ ملین کے ہدف سے بہت کم ہے۔

ملک میں پیداواری عمل میں سستی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے مقابلے میں توانائی کے تجارتی استعمال میں کمی آئی اور سال رواں میں اس میں مزید کمی آئی ہے۔ یہی کیفیت گیس اور بجلی کے استعمال کی ہے۔ توانائی کے تمام وسائل کا یہی حال رہا ہے جو معیشت میں جمود اور سست روی کا ثبوت ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ زراعت شدید مشکلات سے دوچار ہے اور گنے اور چینی کی پیداوار اور ایک حد تک سیمنٹ کو چھوڑ کر زراعت اور صنعت دونوں کساد بازاری کا شکار ہیں۔ سوشل سیکٹر (تعلیم' صحت) اور پبلک سیکٹر میں ترقیاتی مصارف میں برابر کمی ہے اور نجی شعبے میں بھی کریڈٹ کا استعمال سال گذشتہ کے مقابلے میں تقریباً نصف ہے۔

یہ سب علامات معیشت میں جمود کی ہیں' افزونی کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکس سروے اور سی بی آر' حکومت اور فوج کی ساری ترک تازیوں کے باوجود ٹیکس سے حکومت کی آمدنی کا ہدف پورا نہیں ہو رہا۔ اس سال پانچ بار ہدف کو کم کیا گیا ہے جو ۴۵۷ ارب روپے سے کم کر کے اب ۴۱۴ ارب روپے پر لایا جا چکا ہے اور اندازہ ہے کہ عملاً ۴۰۰ یا زیادہ سے زیادہ ۴۰۴ ارب روپے حاصل ہوں گے جس سے بجٹ کا خسارہ ۶۰ ارب کی حد تک بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور یہ سب اس شہرہ عالم ٹیکس سروے کے بعد ہے جس نے حکومت اور اہل تجارت دونوں کے درمیان مہینوں جنگ کی کیفیت پیدا کر دی تھی' فوج بھی میدان میں اتار دی گئی تھی اور وعدے کیے جا رہے تھے کہ اب ٹیکس کی آمدنی میں بیش بہا اضافہ ہوگا' لیکن اگر معیشت میں نمو ہی نہ ہو' سرمایہ کاری ٹھٹھری ہوئی ہو' غربت میں اضافہ ہو رہا ہو' جو تمام عالمی اداروں کی رپورٹوں سے عیاں ہے تو خزانے میں اضافہ کیسے ہو؟ غربت میں اضافے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں آبادی کا ۱۷ فی صد خطِ افلاس سے نیچے تھا جو ۱۹۹۷ء میں ۳۷ فی صد اور ۲۰۰۱ء میں ۳۹ فی صد ہو گیا ہے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے فاقہ کشی سے

ہونے والی اموات اور خودکشیاں پاکستان میں پہلی مرتبہ واقع ہو رہی ہیں۔

ملک میں فی کس آمدنی میں برابر کمی ہو رہی ہے اور پہلی بار ہماری فی کس آمدنی بھارت میں فی کس آمدنی سے کم ہوگئی ہے۔ ۱۹۹۶-۹۷ء میں فی کس آمدنی ۴۹۳ ڈالر تھی جو ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں گھٹ کر ۴۴۶ ڈالر رہ گئی اور ۲۰۰۲ء میں یہ آمدنی صرف ۴۲۹ ڈالر ہے۔ ملکی پیداوار کی ترقی کی رفتار ۳.۸۹ فی صد سالانہ سے کم ہو کر ۲.۳۹ فی صد رہ گئی ہے اور بے روزگاری میں اضافہ لیبر فورس سے ۵.۸۹ فی صد سے بڑھ کر سال رواں میں ۷.۸۲ فی صد ہو گیا ہے۔ قومی بجٹ اور قومی سرمایہ کاری کی شرح میں بھی کمی ہوئی ہے۔ ملکی بچت ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں قومی پیداوار کا ۱۵.۴ فی صد تھیں جو ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں کم ہو کر ۱۴.۵ رہ گئی اور سال رواں میں مزید کمی واقع ہوئی ہے۔ یہی حال سرمایہ کاری کا ہے جو ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں قومی دولت کا ۱۵.۸ فی صد تھی مگر ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں ۱۴.۹ فی صد اور اس سال اس سے بھی کم آ رہی ہے۔ (اسٹیٹ بنک کی سہ ماہی رپورٹ اور نیشنل بنک آف پاکستان کی رپورٹ، پاکستانی معیشت کے کلیدی اشارے، مارچ ۲۰۰۲ء)۔

مہنگائی کمر توڑ صورت اختیار کر گئی ہے۔ بجلی، گیس، پٹرول خصوصیت سے نشانہ ستم ہیں اور سال میں تین تین بار اور چار چار بار اضافہ ہو رہا ہے۔ تنخواہ دار اور کم آمدنی والے خاندان چیخ رہے ہیں، پنشن والے آہ و بکا کر رہے ہیں اور کوئی سننے والا نہیں۔ جب عالمی منڈیوں میں پٹرول کی قیمت کم ہوتی ہے تب بھی یہاں ڈیزل اور پٹرول کی قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی بجٹ سے پہلے ۱۷ فی صد تک کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور بلوچستان کے ٹرانسپورٹر ہڑتال کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

معیشت کی اس صورت حال کو کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرضوں کے بارے میں بھی عملاً اضافہ ہوا ہے گو اضافے کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ یہ بیرونی ساہوکاروں کی نظر التفات اور سیاسی وجوہ سے اور قرضوں کی ری شیڈولنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔

غربت کے خاتمے اور منصفانہ اور خوش حال معاشرے کے قیام کے سلسلے میں کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوئی اور نہ سود کے خاتمے کے لیے کوئی قابل ذکر اقدام ہوا ہے جس کے بارے میں سپریم کورٹ کی دی ہوئی مہلت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کو ختم ہو رہی ہے۔ اطلاعات یہی ہیں کہ اب پھر حکومت مزید وقت کے حصول یا سابقہ فیصلے کو کالعدم کرانے کی درخواست کرنے والی ہے۔ (ڈان، ۱۵ مئی ۲۰۰۲ء)

دنیا میں ہمارا مقام

جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی ساکھ دنیا میں بڑھی ہے، قوم میں اعتماد پیدا ہوا ہے اور ہم سر اٹھا کر چلنے کے لائق ہو گئے ہیں۔ کاش! حقیقت کی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہوتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے

بعد امریکہ نے ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے جنرل صاحب کو تعریف و توصیف کی رشوت تو بہت دی ہے مگر پاکستان نے سیاسی، عسکری، اخلاقی اور معاشی ہر اعتبار سے نقصان ہی نقصان اٹھایا ہے۔ ایک طرف ہزاروں معصوم انسانوں کے خونِ ناحق کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوئی، تو دوسری طرف ہماری اپنی آزادی اور خودمختاری پر شدید ضرب لگی ہے۔ آج ہماری سرزمین پر امریکی فوجوں کے چار اڈے قائم ہیں۔ ہمارے ہوائی اڈوں پر ان کے کمپیوٹر قابض ہیں اور ہر ہر فرد کے بارے میں ساری معلومات ان کی جھولی میں جا رہی ہیں۔ ہماری پولیس ان کی ایف بی آئی کے زیرتربیت ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کی تعلیم دینے کے لیے ۵۸ ملین ڈالر کا پروگرام شروع کر دیا گیا ہے۔ وزیرستان اور فیصل آباد میں ان کے کمانڈو ہماری پولیس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ امریکی سفیر دعویٰ کر رہی ہیں کہ اب ایف بی آئی کے ماہرین محض ہفتہ دو ہفتہ کے معاملے کے لیے نہیں آ رہے، بلکہ یہاں مستقل مقیم ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ کا افغانستان آپریشن کا کمانڈر کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ ''پاکستان میں ہماری فوجیں اس وقت تک رہیں گی جب تک ہم اس کی ضرورت محسوس کریں گے''۔

ہماری معیشت آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ہاتھوں اس طرح گروی ہوگئی ہے کہ اب بجٹ قوم تو کیا، کابینہ کے سامنے آنے سے بھی پہلے عالمی بنک کے نمایندوں سے منظور کرایا جاتا ہے اور ڈیفنس بجٹ، بجٹ کا خسارہ اور آمد و صرف کے تمام تخمینے بنک کے حکام کے ارشادات ہی نہیں احکامات کے مطابق طے ہو رہے ہیں۔ بیرونی ذرائع ابلاغ میں یہ بھی آ رہا ہے کہ ہماری فوجی نقل و حرکت اور نیوکلیر صلاحیت کی مکمل نگرانی کی جا رہی ہے اور اگر لبنان کے امریکی عیسائی مصنف فواد عجمی کا دعویٰ (ریڈرز ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۰۲ء) درست ہے تو اب ہماری ایٹمی تنصیبات امریکہ کی دسترس میں ہیں۔

اس پس منظر میں بھارت اور اسرائیل کا روز افزوں سیاسی اور عسکری تعاون، جنگی ساز و سامان کی بھارت کو فراہمی اور بھارت اور امریکہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور مشترک فوجی مشقیں اور ''سرحدی دہشت گردی'' کے نام پر دونوں کا پاکستان کو بلیک میل کرنا اور بھارت کا ہماری سرحدوں پر چھ ماہ سے فوجوں کو تعینات کرنا اور ایسی مشقیں کرنا جن کی دھول ہماری سرحدوں تک پہنچ رہی ہے وہ خطرناک صورت حال ہے جس میں جنرل صاحب کی قیادت نے ملک کو لا پھنسایا ہے۔ ریفرنڈم میں اخلاقی دیوالیہ ہونے کے بعد، وہ امریکہ اور بھارت دونوں کے لیے زیادہ تر نوالہ بن گئے ہیں اور ان کی زدپذیری (vulnerability) میں خطرناک حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ امن اور عزت بھیک مانگ کر حاصل نہیں ہوتے، وہ تو عزم اور قوت بازو سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو رہ و رسم شہ بازی کی دنیا ہے۔ اس میں دشمن سے مصافحہ اور غیروں سے مصالحت سے کچھ

حاصل نہیں ہوسکتا۔

کارگل کے موقع پر میاں نواز شریف اور صدر کلنٹن میں ہونے والی ملاقات کی تمام تفصیلات خاص طو پر اس موقع پر شائع کی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل وہی منظر دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستانی قوم آج ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جہاں اسے اپنی زندگی، آزادی اور عزت کے تحفظ کے لیے ایک بڑا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس وقت دونوں، یعنی ایک طرف جنرل پرویز مشرف اور پوری فوجی قیادت اور دوسری طرف ملک کی پوری دینی اور سیاسی قیادت ایک عظیم آزمایش سے دوچار ہیں۔ ریفرنڈم نے جنرل صاحب کو کمزور کیا ہے، مضبوط نہیں۔ اور فوج کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قوت کا راز قوم ہے کوئی اور نہیں۔ بھارت اپنی شاطرانہ چالیں بڑی ہوشیاری سے چل رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پر ہے۔ اگر ہم اس کھیل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے تو یہ تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ قوم میں بڑی جان ہے اور اگر اللہ کی رسی کو تھام کر قوم کو ساتھ لیا جائے تو آج بھی ملک نہ صرف اپنا دفاع کرسکتا ہے، بلکہ دشمن کے دانت کھٹے کرسکتا ہے لیکن اس کے لیے ایمان، عزم اور قومی اتحاد اور یگانگت کی ضرورت ہے۔ دشمن کی پوری کوشش ہے (اور جن کو آپ دوست سمجھ رہے ہیں وہ اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں) کہ پاکستانی قیادت کو دباؤ میں لاکر پاکستان کو اپنی کشمیر پالیسی کو بھی اسی طرح تبدیل کرنے پر مجبور کردیں جس طرح کارگل اور پھر افغانستان کی پالیسی کو تبدیل کرایا ہے۔ لیکن یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، سیاسی مصالح کا نہیں۔

پاکستان اور کشمیر ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ اس میں کسی حصے کو پہلے اور کسی کو پیچھے نہیں کیا جاسکتا۔ کشمیر کی تحریک مزاحمت پاکستان کے دفاع کی تحریک ہے اور اس کا کمزور ہونا، پاکستان کا کمزور ہونا بلکہ بالآخر بھارت کے شکنجے میں گرفتار ہوجانے کے مترادف ہوگا۔ یہ وقت بالغ نظری سے دشمن کے کھیل کو سمجھ کر قوم کو اعتماد میں لینے اور قوم میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ہے۔ جس طرح سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے بجا طور پر مطالبہ ہوا ہے کہ اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کریں، اسی طرح فوجی قیادت کے لیے بھی ضروری ہے کہ سیاست میں فوج کی دراندازی کے جو تباہ کن نتائج رونما ہوئے ہیں ان کا اعتراف کرے اور اپنے اصل رول (دفاعِ وطن) کے لیے پورے طور پر یکسو ہوکر اس میں منہمک ہوجائے۔ نظامِ سیاست میں حصہ اور حق مانگنے کی باتیں نہ ملک کے مفاد میں ہیں اور نہ خود فوج اور اس کی دفاعی صلاحیت کے لیے مفید۔ اسے اپنے دائرے میں رہنا چاہیے تاکہ اسے اس کا حق مل سکے لیکن اس کا کوئی ایسا کردار نہیں جو اسے اقتدار میں شریک بنانے سے عبارت ہو۔ قائداعظمؒ اور ان کے تصور پاکستان کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن قائد کے تصور سے کسی وفاداری کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔

قائداعظم کی ہدایات

آیئے اس سلسلے میں قائداعظمؒ کے محکم ارشادات کو کسی تحفظ کے بغیر قبول کریں اور بیوروکریسی اور فوج دونوں کو ان حدود کا پابند کریں جو ان کی کارکردگی کے لیے ضروری ہیں۔ اہل سیاست بھی اپنے طور طریقے درست کریں اور ایک نظام اخلاق کی پابندی کا عہد کریں اور بیوروکریسی اور فوج بھی اپنی حدود کی پابند ہو۔ قومی یک جہتی ہی کے لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد انتخابات کا اہتمام کیا جائے اور حقیقی معنوں میں شفاف، آزاد اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے ملک میں نئی سیاسی قیادت کو زمامِ کار سونپی جائے تاکہ سب مل کر دستور کو اس کی صحیح اسپرٹ میں چلانے اور اس کا احترام کرنے کا عہد اور اہتمام کریں۔

قائداعظمؒ نے اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ یہ ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ کے مقام پر سول حکام کو خطاب کرتے انھوں نے فرمایا:

> آپ کو اپنا فرض منصبی خادموں کی طرح انجام دینا ہے۔ آپ کو اِس سیاسی جماعت سے یا اُس سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ آپ کا کام نہیں، یہ سیاست دانوں کا کام ہے کہ وہ موجودہ آئین کے تحت یا آیندہ آئین، جو بالآخر تشکیل پائے گا، کے تحت اپنے موقف کے لیے لڑیں۔ لہٰذا آپ کا نہ اِس سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس سیاسی جماعت سے۔ آپ سرکاری ملازم ہیں۔ جس جماعت کو اکثریت حاصل ہوگی وہ حکومت بنائے گی اور آپ کا فرض ہے کہ آپ وقتی طور پر اس حکومت کی خدمت ملازمین کی طرح کریں، سیاست دانوں کی طرح نہیں۔

پھر پشاور میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو گزٹیڈ افسران کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> آپ کو کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاست دان کے سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت کو بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی دباؤ کا شکار نہیں ہونا چاہیے، اپنا فرض منصبی عوام اور ملک کے خادم بن کر بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔

اور پھر ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں اسٹاف کالج میں فوجی قیادت کو واضح ہدایات دیں:

> ایک بات اور ہے۔ مجھے یہ بات کہنے کی تحریک اس لیے ہوئی ہے کہ ایک دو نہایت اعلیٰ افسروں کے ساتھ گفتگو کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ افواج پاکستان نے جو حلف اٹھایا ہے انھیں اس کے مضمرات کا علم نہیں ہے۔ بلاشبہہ حلف تو ایک ظاہری شکل وصورت کی بات ہوتی ہے۔ جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے، وہ ہے صحیح جذبہ اور اس کی روح۔ لیکن اس معاملے میں شکل وصورت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں اس موقع پر آپ کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے مقررہ حلف کے الفاظ پڑھتا ہوں:

> ’’میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور مملکت پاکستان کا وفادار رہوں گا۔ (آئین اور مملکت پاکستان کے الفاظ پر توجہ فرمایئے اور یہ) کہ میں مملکت پاکستان کی افواج میں دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ خدمات سرانجام دینے کا پابند رہوں گا‘ اور اپنی بھرتی کی شرائط کے مطابق جہاں کہیں بھی ہوائی‘ بری اور بحری ذریعے سے جانے کا حکم ملے گا‘ جاؤں گا۔ اور میں ان تمام احکام کو بجالاؤں گا جو میرے اوپر تعینات شدہ افسر جاری کرے گا‘‘۔
>
> جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اصل بات تو جذبہ ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں مملکت کے آئین کا وفادار رہوں گا تو آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو فی الوقت پاکستان میں نافذالعمل ہے اور اس کے حقیقی اور قانونی مضمرات کو سمجھیں۔

قائد کے اس ارشاد کی روشنی میں سول اور فوجی ملازمین کی ذمہ داری ہے کہ دستور کا مطالعہ کریں اور اس حلف پر قائم ہو جائیں جو دستور میں مرقوم ہے۔ جو بھی اس عہد سے سرموانحراف کرے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے تاکہ آیندہ کسی کو اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔

ان حالات میں پوری قوم اور خود فوجی قیادت کے لیے اصلاح احوال کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اکتوبر کے انتخابات کی تیاری اور پوری دیانت کے ساتھ دستور کے مطابق منتخب قیادت کو زمام کار کی منتقلی۔ انتقام کی سیاست کی جگہ انصاف کی سیاست کا قیام وقت کی ضرورت ہے۔ جنرل پرویز مشرف کو بھی حالات کا دردمندی اور بصیرت سے جائزہ لینا چاہیے اور عوام کے فیصلے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ کوئی شخص قانون سے بالا نہیں اور کوئی انسان ناگزیر نہیں۔ ملک کی ترقی اور استحکام‘ ملک کے نظریے سے وفاداری‘ قوم کی بیداری‘ اور اصلاح کے لیے قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں ہے۔

اگر ہماری قیادت ریفرنڈم کے تلخ پیغامات سے یہ سبق حاصل کرلے تو شر سے خیر پیدا ہوسکتا ہے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر ایک بار پھر گامزن ہوسکتا ہے۔ خدا کرے کہ اس نازک لمحے میں یہ قوم اور اس کی قیادت صحیح فیصلہ کر سکے تاکہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور صبح امید‘ نئی روشنی لیے ہوئے نمودار ہو سکے ؎

گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے
آغوش میں ہرشب کے سحر ہوتی ہے